ترقی پسند تنقید اور عصری شعور

ڈاکٹر محمد امجد عابدؔ☆
Dr. Muhammad Amjad Abid

ABSTRACT:

The Aim of progressive movement was welfare of people. The writers of the said movement believe that economical aspect is fundamental for human life. Progressive writers took keen interest in socio economical issues. They wanted to create such awareness among people. So that they may change capitalist economic system to socialist economic system. If seen carefully then its only progressive movement which create direct relation with contemporary awareness. It, with the help of contemporary consciousness, not only solved problems of the time but also kept eyes on the problems and issues of related people of that era. It helped in solving the problems as well. That is why progressive writers seem linked with contemporary consiousness and their writings encompass the feel and emotions of life. This essay deals with the contemporary conciousness of the critics of Progressive Movement.

ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود تھا۔ اس میں ہر مسلک اور نظریے کا ایسا ادیب شامل ہو سکتا تھا جو انسانیت کی سربلندی اور اس کی رفعتوں پر یقین رکھتا ہو۔ تاہم ابتدا ہی سے اس تحریک پر اشترا کی نظریات کے حامل ادیبوں کا غلبہ رہا۔ جس کے پرچارک اہم نقادوں نے ترقی پسندی کے نام پر مارکس، اینگلز اور لینن کے نظریات سے رہنمائی حاصل کی۔ ان ادیبوں کا یہ نقطہ نظر تھا کہ انسانی زندگی میں اقتصادی پہلو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کسی بھی خطے کے لوگوں کی تہذیب و معاشرت اور ساری زندگی ذرائع معاش اور خطے کے عام لوگوں کی معاشی حالت سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ اسی لیے ترقی پسند ادیب معاشرے کے معاشی مسائل میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے اور ادب کے ذریعے عوام میں ایسی آگہی پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہتے تھے کہ وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظامِ معاش کو بدل کر اشترا کی نظامِ معاش

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور

کی منزل حاصل کر لیں۔ بقول ڈاکٹر ضیاالحسن یہی وجہ ہے کہ ہم اس تحریک سے منسلک شاعروں اور تخلیق کاروں میں انقلاب کی گھن گرج محسوس کرتے ہیں۔ اس انقلابی شکوہ سے ڈر کر پہلے برطانوی دور میں اشتراکی ادیب پابند سلاسل ہوئے اور پھر ۱۹۵۳ء میں بھی اس انجمن کو پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔(۱)

انقلاب کی بازگشت تمام ترقی پسندوں کے ہاں کہیں اونچی لے میں اور کہیں دھیمی لے میں سنائی دیتی ہے۔ تمام ترقی پسند ادیبوں کو ایک ڈسپلن کا پابند کر کے انہیں یہ باور کرایا گیا کہ انقلابی تحریک میں پوری طرح حصہ لیے بغیر ذہنی و جذباتی ترقی ناممکن ہے اور انقلابی ادب زندگی سے الگ ہو کر نہیں پنپ سکتا۔ زندگی سے مراد انسان کی سماجی زندگی ہے جس میں انسانوں کے درمیان کسی نوع کی تفریق کا تصور غلط اور فرسودہ ہے۔ چنانچہ ادب کا یہ فرضِ اوّلین قرار دیا گیا کہ وہ دنیا سے قوم و وطن، رنگ و نسل، طبقے اور مذہب کی تفریق مٹانے کی کوشش کرے۔ انہیں مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقوں کے ساتھ گھل مِل کر ان کے مسائل سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ عوام کی زندگی سے ان کا براہِ راست تعلق پیدا ہو سکے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو تنقید کے پورے منظر نامے میں ترقی پسند تحریک ہی واحد ایسی تحریک تھی جس نے براہِ راست عصری شعور سے تعلق اُستوار کیا۔ اس نے عصری شعور کے ذریعے نہ صرف اپنے عہد کے چھوٹے بڑے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اس عہد سے وابستہ لوگوں کی مصیبتوں، مشکلات اور مسائل پر نظر رکھی۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں اور نقادوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری استحصال پسندوں کے وہ ہتھیار ہیں جن سے مزدوروں اور نچلے طبقے کے مجبور لوگوں کے ارمانوں کا خون کیا جاتا ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں کہ ہندوستانی ترقی پسند تحریک دنیا میں ترقی پسندی کی تحریک، اشتراکیت کے اصولوں کے پرچار، فاشزم کے خلاف تمدنی اور ادبی محاذ قائم کرنے کی تحریک کا ایک حصہ ہے...... یہ سچ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں انسانی دکھ درد کو دور کرنے اور زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے جو تدبیریں سوچی جا رہی ہیں اور جو ذرائع اختیار کیے جا رہے ہیں۔ ان میں ایک طرح کی یکسانیت ہے۔ آپس کی خونریزی اور جنگ کے باوجود انسان ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ خاص طور پر وہ طبقے جن کے مسائل میں یکسانیت اور جن کے مفاد کی نوعیت میں اشتراک ہے ان کا طریقِ فکر یکساں ہے۔(۲) سرمایہ داری نظام کے بارے میں سجاد ظہیر کا یہ کہنا تھا:

> ''سرمایہ داری نظام جس نے آج دنیا کو تباہی کی اس حد تک پہنچا دیا ہے جس کا قیام تہذیب و تمدن کے مسلسل انحطاط اور بے حد بربادی کے مترادف ہے۔ آج صرف اشتراکی نظام سے ہی بدلا جا سکتا ہے۔''(۳)

چنانچہ تخلیقی ادب کی طرح ترقی پسند نقاد بھی اشتراکی نظریات کی روشنی میں فن پاروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے عمرانی یا سماجی اساس برآمد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاالحسن کے خیال میں ''اشتراکی یا

مارکسی نقاد یہ دیکھتا ہے کہ کسی فن پارے میں اس دور کی معاشی کشمکش کی عکاسی ہوئی ہے یا نہیں۔ اس دور میں کونسا نظامِ معاش رائج تھا اور اس کے اس دور کی زندگی اور ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ ترقی پسند نقاد مارکس کی جدلیاتی منطق کو بھی ادب پر منطبق کرتے ہیں......ترقی پسند نقاد ابتدا میں انتہا پسندانہ رویّوں کے حامل رہے لیکن آہستہ آہستہ تحریک کو فکر کی پختگی کے ساتھ ان کے رویوں میں بھی توازن پیدا ہوا۔''(۴) ترقی پسند تحریک کے اہم نقادوں میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، عزیز احمد احتشام حسین، ممتاز حسین، علی سردار جعفری، ظہیر کاشمیری، مجتبیٰ حسین، خلیل الرحمن اعظمی اور دیگر نقاد شامل ہیں۔

اختر حسین رائے پوری کو ترقی پسند تحریک کے پہلے باضابطہ تنقید نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے جولائی ۱۹۳۵ء میں ''ادب اور زندگی'' کے نام سے ایک مضمون لکھ کر مارکسی طرزِ فکر کے مطابق خیالات پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ مضمون بہت مشہور ہوا کیونکہ اس میں ادبی مسائل کا جائزہ ایک بالکل نئے نقطۂ نظر سے لیا گیا تھا۔ اس مضمون کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ انھوں نے ادب اور زندگی، ادب و انقلاب، روایت و بغاوت، طبقاتی کشمکش، اقتصادی جبریت، سماجی مساوات، ترقی پسند رجحانات اور ان کے لوازم سے پیدا ہونے والی لفظیات و معنیات سے اردو کو اس وقت بہرہ ور کیا جب انجمن ترقی پسند مصنّفین کا خاکہ لندن میں مرتب ہو رہا تھا اور کسی باقاعدہ تحریک یا انجمن کا قیام ہنوز عمل میں نہیں آیا تھا۔(۵) چنانچہ ''ادب اور زندگی'' اُن کا وہ بنیادی مقالہ ہے جس نے نہ صرف ان کی فکری زندگی کی بنیاد رکھی بلکہ اردو تنقید میں بھی ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس مضمون کا سب سے چونکا دینے والا حصہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں مصنف نے قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ کیا ہے اور سنسکرت، ہندی، بنگالی، گجراتی اور متعدد زبانوں کے ادب کو طبقاتی کشمکش کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص طور پر اردو کے قدیم ادبی سرمائے کی تحقیر و تذلیل میں وہ حد سے بڑھ گئے۔ بقول خلیل الرحمن اعظمی ''ٹیگور کو فراری اور اقبال کو فسطائیت کا نمائندہ ثابت کرنے میں بھی انھوں نے عجلت سے کام لیا ہے۔''(۶)

اردو اور دیگر زبانوں کے قدیم ادب کے بارے میں اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> ''سچ پوچھا جائے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ ضائع ہوئے ہیں۔ اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ہوا ہی نہیں۔ کالی داس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شائد کوئی شاعر ایسا نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا۔''(۷)

ان کے ایک اور مضمون ''ادب اور احتساب'' کا بھی کافی شہرہ رہا۔ اس مضمون میں وہ ان نام نہاد نقادوں کی تنقید کو رد کر دیتے ہیں جو ذاتی مفادات کے حوالے سے ادب کا احتساب کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اختر حسین رائے پوری جدید ادب کے تو قائل ہیں لیکن وہ ہر جدید ادب کو ترقی پسند ادب نہیں کہتے۔ بلکہ ادب کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں اور اس میں موجود خوبیوں اور خامیوں کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ وہ صرف اس لیے جدید ادب کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہو جاتے کہ وہ جدید ہے۔ ترقی

پسند تحریک سے ایک جذباتی وابستگی رکھنے کے باعث ان کی تنقید میں تلخی اور درشتی کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ پورے تیقّن سے بات کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کے نقطۂ نظر میں کہیں کوئی کمی بھی ہو سکتی ہے ان کا یہ تنقیدی انداز بہت سے طبقوں کو ناگوار بھی گزرا لیکن وہ بڑی شدت سے اپنے اس تنقیدی مسلک پر قائم رہے اور اس بات کا برملا اظہار کرتے رہے کہ وہ ادیب جو اپنے ادب میں زندگی کے مسائل کو بیان تو کرتے ہیں لیکن ان کی حیثیت ایک تماشائی کی رہتی ہے اور وہ غریب طبقوں کے حق میں آواز اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتے انہیں قرطاس وقلم سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ مظفر علی سید نے ان کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:

''وہ نہ کسی تنظیم کے ترجمان بنے، نہ کسی ادبی شخصیت کے آلہ کار، انھوں نے اپنے مطالعہ اور سوچ بچار کی روشنی میں وہی کچھ لکھا جسے انھوں نے درست سمجھا اور اس کے باوجود اپنی تنقیدی ہونہاری کو تسلسل کے ساتھ جاری نہ رکھ سکے اور اس کو پوری طرح نشوونما نہ دے سکے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے تنقید بہت مشکل کام ہے۔''(۸)

سید سجاد ظہیر ترقی پسند ادب کے بانیوں میں سے ایک ہیں انھوں نے تخلیقی نثر لکھنے کے ساتھ ساتھ تنقید کی طرف بھی توجہ کی۔ اپنی تنقید میں انھوں نے ترقی پسند نقطۂ نظر کی پوری طرح وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابقہ میں ان کی تنقید میں مارکسی تنقید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ادبیات بلکہ دنیا بھر کے علوم اور خصوصاً سیاسیات، اقتصادیات ومعاشیات کا مطالعہ بغور کیا ہے۔ اس کے اثرات ان کی تنقید میں بھی ملتے ہی۔ سجاد ظہیر ادب اور زندگی کے ہم آہنگ ہونے کے قائل ہیں اور زندگی ان کے خیال میں معاشی معاشرتی حالات کے مدّوجزر کا نام ہے۔ اسی وجہ سے ادب کا ان حالات سے متاثر ہونا ناگزیر ہے بلکہ ادب انہی حالات وکیفیات کے مدوجزر کا نام ہے۔(۹) تقریباً یہی بات ڈاکٹر انور سدید نے بھی ان کے بارے میں لکھی ہے۔ وہ ان کی کتاب ''روشنائی'' کو ترقی پسند تحریک کی تاریخ اور کسی حد تک تنقید قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے نقطۂ خیال میں بنیادی اہمیت مارکسیت کو حاصل ہے وہ انسانی رشتوں کے تعین میں مادی حالات اور ذرائع پیداوار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں چنانچہ خیالات، تصوّرات اور عقائد وغیرہ سماجی عمل کا عکس ہیں۔ انھوں نے باور کرایا کہ موجودہ دور میں احیاء پرستی، ریاکاری اپنے وطن سے غداری ہے اور آلات ہنر زندگی کا دھارا موڑ دیتے ہیں...... معنوی طور پر ان کی تنقید اشترا کی نقطۂ نظر کی وضاحت اور ادب میں اس کے فیصلہ کن اظہار کی مثال ہے۔ اس تنقید نے ترقی پسند تحریک کی نظریاتی اساس کو مستحکم بنانے میں خاصی مدد دی۔(۱۰) سجاد ظہیر کی کتاب ''روشنائی'' نے ادبی حلقوں میں خوب شہرت حاصل کی۔ اسے ترقی پسند تحریک کی تاریخ اور تذکرے کے حوالے سے بنیادی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک کی عہد بہ عہد ترقی کو بڑی دیانتداری سے قلمبند کیا گیا ہے اور ان اعتراضات کا بھی بڑی خوش اسلوبی اور تفصیل سے جواب دیا ہے جو مخالف حلقوں کی طرف

سے کیے جاتے رہے تھے۔ روشنائی میں سجاد ظہیر نے جہاں حالات کے بیان میں اعتراضات کا رد بیان کیا ہے اور مختلف ادبی شخصیتوں کے رویوں اور طرزِ عمل کا تجزیہ کیا ہے وہاں ان کی تنقیدی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ انھوں نے ''روشنائی'' کے علاوہ باقاعدہ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جن کا دائرہ اگرچہ محدود ہے لیکن ''اردو کی جدید انقلابی شاعری''، ''سراج مبین''، ''غلط رجحان''، ''شعرِ محض'' وغیرہ چند مضامین اور دوسرے لوگوں کی کتابوں پر لکھے گئے پیش لفظ اور ''ذکرِ حافظ'' ان کے قلم سے نکلے ہوئے ایسے عمدہ مضامین ہیں جنھوں نے ان کی تنقید کو ثبات بخشا ہے اور اردو تنقید میں ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔ ان کی سب سے پہلی کاوش وہ مضمون ہے جو ۱۹۳۹ء کے نیا ادب میں ''اردو کی جدید انقلابی شاعری'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون جہاں ایک طرف ترقی پسند نظریہ شاعری سے بحث کر کے نوجوان ترقی پسند شاعروں کو انقلاب کے صحیح مفہوم سے آشنا کرتا ہے وہاں جذباتی اور ہیجانی قسم کی شاعری کی جگہ صحیح معنوں میں ترقی پسند شاعری کی ترغیب بھی دیتا ہے اور دوسری جانب بدلتے ہوئے سماجی تناظرت میں ادیب کے تغیر پذیر خیالات و نظریات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

سجاد ظہیر ادب کو اس کے سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی ترقی پسند تنقید کا بنیادی مزاج ہے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے سنٹرل جیل لکھنؤ سے ''سراج مبین'' کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے کلاسیکل ادب پر ہونے والے اعتراضات کا مدلل جواب دیتے ہوئے قدیم اصنافِ سخن کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی، واسوخت، قطعہ اور گیت وغیرہ تمام قدیم ادب کو اہم ادبی ورثہ قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ساقط اور ابدی کوئی شے نہیں ہے۔ ہر شے میں وقت کی تبدیلی کے ساتھ فطری تبدیلی آتی رہتی ہے۔ نئی چیز کا وجود قدیم روایت کے بغیر محال ہے۔ اس لیے قدیم روایات اور اقدار سے نفرت غلط نظریہ ہے۔ اسی مضمون میں انھوں نے یہ واضح کیا کہ ترقی پسند شاعری کا مقصد کیا ہے اور ترقی پسند ادیب اس مقصد کو کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون ''غلط رجحان'' جو شاہراہ دہلی کے فروری مارچ ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اس مضمون میں انھوں نے چند ترقی پسند ناقدین کے غلط رجحانات کی گرفت کرتے ہوئے ادبی مطالعے خصوصاً ماضی کے ادبی ورثے کے مطالعے کے ترقی پسند طریقہ کار سے روشناس کرانے کی کوشش کی تھی۔ یہ مضمون دراصل خواجہ احمد فاروقی کی مرتبہ مثنوی ''زہرِ عشق'' پر ہنس راج رہبر کے تبصرہ کے جواب میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں سجاد ظہیر نے نواب مرزا شوق کی مثنوی ''زہرِ عشق'' کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ اس میں ایسی محبت کے گہرے المیے کا بڑی سادگی اور ہمدردی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے جس کے بار آور ہونے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس میں ایک طرف سماج کے رسوم اور تصوّرات کا تذکرہ ہے تو دوسری طرف اس میں دو معمولی انسانوں کی سچی محبت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد ہمیں ان دونوں کرداروں سے ہمدردی اور جاگیری سماج کے ظالمانہ قوانین اور رسوم سے نفرت ہوتی ہے۔ سجاد ظہیر کے کچھ اور مضامین بھی

''جدید فرانسیسی شاعری'' اور ''شعرِ محض'' کے موضوعات پر ہیں۔
بقول خلیل الرحمن اعظمی:

> ''ان مضامین میں بھی ان کے یہاں نظریاتی پختگی اور مارکسی اندازِ فکر کو برقرار رکھتے ہوئے ادب اور فن کو ادب اور فن ہی کی طرح دیکھنے کی روش ملتی ہے۔ اگر دورِ حاضر کے اردو شعرا کو وہ اپنی تنقید کے لیے منتخب کرتے اور ان کے کلام کے حسن و قبح پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے تو ترقی پسند شاعری کا دھارا کسی اور ہی سمت میں بہتا اور ہمارے شعرا بہت سی ایسی کوتاہیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے جن کا ادراک نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تخلیقی شخصیتوں نے وہ رخ اختیار کر لیا جہاں پہنچ کر وہ حسن اور فسوں کاری کے راستوں سے دور ہوتے گئے۔''(۱۱)

سجاد ظہیر کے محدود لیکن موثر اور نظریہ ساز تنقیدی کام کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ بیشتر ترقی پسند نقادوں کی طرح جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے۔ انھوں نے ترقی پسندوں کے نزدیک بہت سی ممنوعات کو حلال قرار دے کر وسعت نظر اور کشادہ فکری کا مظاہرہ کیا اور خود کو ایک ایسے عصری شعور سے وابستہ کیا جس میں کسی عہد کے حالات و واقعات کے ساتھ انسانی جذبات، احساسات اور کیفیات کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ سجاد ظہیر کا یہ نقطہ نظر ادب کے بارے میں ترقی پسند نقطہ نظر کو زیادہ واضح اور وسیع کر دیتا ہے۔

عزیز احمد نے ترقی پسند تنقید کا جو نکتہ نظر پیش کیا وہ ادب کے حوالے سے زیادہ قابل قبول ہے۔ عزیز احمد نے اپنی تنقید میں ترقی پسندی کا جو نقطہ نظر وضع کیا اس کی بنیادی بات یہ تھی کہ ادبی ترقی پسندی یہ نہیں ہے کہ ادیب محض جبر واستحصال کے خلاف آواز بلند کرے بلکہ اس آواز میں تخلیقی توانائی بھی ہونی چاہیے جو دلوں کو مسخر کر لے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کے ذریعے حقیقت نگاری، انقلابی قدریں، جدید تحریک اور اردو شعر و نثر کی مختلف اصناف میں ترقی پسندی کی وضاحت کر کے اس کے صحیح نقطہ نظر کو پیش کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے سب سے پہلے حقیقت نگاری کی بحث اٹھائی ہے کیونکہ ترقی پسند ادیب معاشرے کی حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام اعلیٰ ادب کی بنیاد حقیقت نگاری پر ہے۔ اصل فرق یہ ہے کہ مختلف ادوار میں ادیب مختلف حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں۔ کبھی کسی عہد میں حقیقت کا کوئی پہلو اہم ہو جاتا ہے اور کسی دوسرے دور میں کوئی دوسرا پہلو زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً کلاسیکی اردو ادب خاص حقیقتوں کی بجائے عام حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں خاص و عام کے الفاظ ابہام پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے وضاحت نہیں کی کہ خاص حقیقت اور عام حقیقت سے ان کی کیا مراد ہے۔

عزیز احمد ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادب جو زندگی کا پابند ہے وہ

زندگی سے گریز کر ہی نہیں سکتا انقلاب سے ہمیشہ متاثر ہوتا رہتا ہے کبھی کبھی وہ انقلاب کا پیشرو بھی بن جاتا ہے کیونکہ وہ صاحبِ دماغ آدمیوں کا آلہ کار ہوتا ہے۔ ادب برائے ادب کے نظریے کو وہ جاندار نہیں سمجھتے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی وہ ادب کی سماجی اہمیت کے بھی قائل ہیں لیکن ادب کے ذریعے اشتراکی اصولوں کے پرچار کو اپنا نصب العین نہیں بناتے۔[۱۲] بہرحال وہ حقیقت و واقعیت کو ادب کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ماضی کے ادبی ورثے کو مسترد کرنے کے لیے ترقی پسند نقاد مارکسی طرزِ فکر اور طبقاتی کشمکش کے نظریے کا سہارا لیتے تھے اور ان کا یہ کہنا تھا کہ تہذیب وسماج کے تمام مذاہب میں اقتصادی عنصر ہی سب سے اہم عنصر ہے اور وہی فنونِ لطیفہ کی اقدار کا بھی تعین کرتا ہے۔ عزیز احمد کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بھی ترقی پسند نقاد حقیقت کو میکانکی انداز میں دیکھ رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قطعی اعتراضات سے پہلے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہمدردی کے ساتھ قدیم ادب کا پھر مطالعہ کیا جائے اور اس میں ترقی پسندی اور انسانیت کے بہت سے جوہر ملیں گے۔ اس پورے ادب کو طبقاتی کشمکش کی کسوٹی پر رد کر دینا ٹھیک نہیں۔ جہاں سے جتنی مدد مل سکے لینی چاہیے اور مستقبل کی تعمیر میں ماضی کے انسان اور ترقی پسندی کے جوہروں سے برابر اعانت حاصل کرنی چاہیے۔''[۱۳]

''ترقی پسند ادب'' میں اس طرح کے متعدد نکات ہیں جو عزیز احمد کی تنقیدی صلاحیت اور ان کی سوجھ بوجھ کا پتہ دیتے ہیں۔ ترقی پسندی کی تعریف حقیقت نگاری اور ادب میں انقلاب کے تصور کو عزیز احمد نے مغربی ادب کے پورے پس منظر میں رکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ عزیز احمد کی تنقید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جہاں انقلابی اقدار کی بات کی ہے وہاں ان کے نظریات پر ترقی پسند تحریک اور ایلیٹ کے تصوراتِ روایت کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نہ تو ادب کی روایتیں منجمد ہوتی ہیں اور نہ انقلابی اقدار دائمی ہوتی ہیں۔ ادب ہمیشہ انقلابِ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی راہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتا ہے۔ ہر ادبی روایت پہلے اپنے اندر انقلابی جوہر لیے آتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی انقلابی روح ختم ہوجاتی ہے اور باقی صرف خالی سانچہ رہ جاتا ہے۔ کم درجہ شاعر اس بے روح روایت سے چمٹے رہتے ہیں لیکن بڑے شعرا اسی روایت کے زندہ عناصر کے تسلسل میں نئی انقلابی اقدار تخلیق کرتے ہیں۔ یوں دریائے ادب کی روانی برقرار رہتی ہے۔ عزیز احمد کے اس نقطۂ نظر کی اہمیت صاف عیاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عصری شعور ہی اپنے عہد کے ہمہ جہت تغیرات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات کہ ادب ہمیشہ انقلاب زمانہ سے متاثر ہوتا ہے سو فیصد درست ہے۔ کیونکہ انقلابِ زمانہ دراصل عصری آگہی اور عصری شعور کی ایک خوش کن تصویر ہے۔ کیونکہ عصری شعور سے شناسائی انقلابِ زمانہ کی مختلف کروٹوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ عزیز احمد نے صرف تخلیقی نظریہ سازی ہی نہیں کہ بلکہ اسے تخلیقی انداز میں ادب پر منطبق بھی کیا ہے۔ وہ میر کو پہلا انقلابی شاعر قرار

دیتے ہیں جس نے ایہام گوئی کے جمود کو توڑ کر تخلیقی شعری صوتے دریافت کیے۔ میرؔ کی روایت جب ادب میں دم توڑنے لگی تو غالبؔ و مومنؔ نے اس میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ عزیز احمد نے اقبال پر ترقی پسندوں کے اعتراضات کا جواب بھی دیا۔ عزیز احمد وضاحت کرتے ہیں کہ اشتراکیت کی لڑائی مذہب سے نہیں بلکہ مذہبی توہم پرستی سے ہے اور اسی کو اشتراکیت نے افیون کہا ہے۔ اقبال کا نکتہ نظر بھی یہی ہے۔ فکرِ اقبال اور مارکسزم میں محض روحانیت کا فرق ہے اور اقبال کا مذہبی نکتہ نظر بھی عام مذہبی نکتہ نظر نہیں ہے بلکہ اس میں بھی تخلیقیت اور گہرائی ہے۔ ''اقبال نئی تشکیل'' میں عزیز احمد نے نہایت تفصیل سے اقبال کے ذہنی اور تخلیقی ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ ان کی کتاب ''اقبال اور پاکستانی ادب'' بھی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن جتنے مربوط انداز میں انھوں نے اس کتاب میں اقبالی فکر کو پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

عزیز احمد کی تنقید کا دائرہ ہمہ جہت ہے۔ اردو تنقید خصوصاً ترقی پسند تنقید کے حوالے سے ان کی کاوشوں نے اہم نتائج پیدا کیے۔ انھوں نے اس زمانے میں ترقی پسندوں کے رویّوں اور چند ایسے ترقی پسندوں کے کام پر گرفت کی جب ایسا کرنے کا یارا کسی میں نہ تھا۔ بقول شہزاد منظر:

> ''عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک کو مخصوص نقطہ نظر سے دیکھا اور اردو ادب کی قدیم تاریخ کی روشنی میں اس تحریک اور نظریے کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھانے کی کوشش کی......ترقی پسندی کا پرجوش حامی اور علمبردار ہونے کے باوجود ان میں کسی قسم کی تنگ نظری نہیں تھی اور انھوں نے ترقی پسندی کے ہر مخالف کو قدامت پسند یا رجعت پسند قرار نہیں دیا۔''(۱۴)

سید احتشام حسین ترقی پسند تنقید کے ان نقادوں میں شمار ہوتے ہیں جو شعر و ادب کے علاوہ تاریخ، سیاسیات، اقتصادیات، عمرانیات اور دیگر سماجی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے مارکسزم اور جدلیاتی مادیت کے فلسفے کو بہت سوچ سمجھ کر قبول کیا۔ اور فلسفہ حیات سے ان کی پرخلوص وابستگی نے ایک مستحکم اور اٹل عقیدے کی صورت اختیار کر لی۔ آپ ادب کو نعرہ بازی اور انقلاب برپا کرنے والا آلہ نہیں سمجھتے اور نہ ہی ادب کو موضوع تک محدود کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بہت سے مقالات میں فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو ادب کا لازمی جزو قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں ان کا انداز نہایت واضح اور مدلل ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تنقید میں احتشام حسین نظریاتی استقلال کی سب سے مستحکم آواز تھے اور آج ترقی پسند تحریک میں جتنی روشنی نظر آتی ہے اس میں سے بیشتر احتشام حسین کی تنقید سے ہی پھوٹی ہے۔ ترقی پسند تنقید میں احتشام حسین اعتدال اور توازن مثال ہے۔''(۱۵)

ادب کی افادیت، مقصدیت یا سماجی کردار صرف مارکسی نقادوں اور ترقی پسندوں سے مخصوص نہیں۔ اس نظریے کے حق اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ انتہا پسندی کی وجہ سے ابتدا میں نہ تو معتدل رہا اور نہ ہی مدلل۔ جس کی وجہ سے اس نظریے کی تفہیم میں مشکل پیش آئی اور اسے مخالفت کا سامنا

بھی کرنا پڑا۔ کچھ ترقی پسند تخلیق کاروں نے تخلیقی شعور کے بغیر تخلیقی تجربہ کرنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارے ترقی پسند نقاد جذباتی یا سارے ترقی پسند تخلیق کار نعرہ باز تھے۔ انھی میں بہت سے خوبصورت لکھنے والے بھی تھے جن سے تحریک کو تقویت حاصل ہوئی اور جو اس بات کو پوری طرح سمجھتے تھے کہ ادب کے لیے فن اور جمالیات لازمی ہیں۔ اس حوالہ سے احتشام حسین کا مضمون ''ادبی تنقید قدر و معیار کی جستجو'' بہت مدلل اور واضح ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ادیب کی پابندی اور آزادی کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ مختلف تنقیدی دبستانوں کا جائزہ بھی عام فہم انداز میں لیا ہے کہ ان میں تنقید کی تفہیم کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ ادبی اور غیر ادبی دونوں قدروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر زبان کے ادب اور صنف کے مطالعہ کے الگ الگ طریقہ ہائے کار ہیں۔ کسی ایک طریقہ، نظریہ یا علم سے ادبی تخلیق کو پرکھنے سے ادب کی کلی تفہیم ممکن نہیں۔ احتشام حسین کی تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے ہے کہ احتشام حسین نے اپنے مخصوص تصور ادب یعنی ادب کی مادی تعبیر کی جب بات کی اور انھوں نے مقالات میں جب خامہ فرسائی کی ہے.....تو اسے نعرہ بنا دینے کے برعکس زندگی کو متحرک اور مفلوج کر دینے والے عوامل اور سماج کا انداز طے کرنے والے محرکات کو پیشِ نظر رکھ کر بات کی۔ یہ تصور جو اپنی نظریاتی صورت میں خاصا پیچیدہ ہے۔ احتشام حسین کے سہل اسلوب میں اپنی مختلف جزئیات سمیت نکھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ تصور انھیں بہت مرغوب ہے۔ اتنا کہ اس پر ان کی تنقیدی فکر کی اساس استوار بھی ہے اور اس سے پائیداری اور استحکام بھی حاصل کرتی ہے۔(۱۶)

احتشام حسین کے بارے میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ معتدل فکر رکھنے والے نقاد ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے لیکن جب وہ ماضی کے عظیم ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس فکری سانچے سے باہر نہیں نکلتے جو ترقی پسند تحریک نے ابتدا ہی سے کلاسیکی ادب کے لیے تیار کر لیا تھا کہ وہ ادب جاگیرداری دور کی پیداوار ہے۔ مادی جدلیات سے بے بہرہ ہے اس لیے اس کے چند عناصر تو قابلِ قبول ہیں باقی رد کیے جانے کے لائق ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مسلمان صوفیوں، بادشاہوں اور امیروں نے اسے عوام سے ہٹا کر طبقاتی زبان کی شکل دے دی اور اس کے ادب میں وہی جذبات، وہی خیالات آنے لگے جنھیں درباروں اور خانقاہوں سے پسندیدگی کی سند مل سکتی تھی۔''(۱۷)

احتشام حسین نے دیگر ترقی پسندوں کی طرح کلاسیکی شاعروں میں سے صرف نظیر، غالب، انیس، اقبال اور حالی کے علاوہ دیگر تمام ادب کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ان کی تنقید اور نظریے کا اطلاق صرف تخلیقی فنکاروں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ انھوں نے ترقی پسند نقادوں کی بھی فکری اصلاح اور تربیت کی۔ انھوں نے مادی جدلیت کی وسیع توجیح کی اور بتایا کہ یہ اصول صرف سماج اور ادب کے موضوعات پر ہی منطبق نہیں ہوتا بلکہ فن اور جمالیات بھی اس کی ذیل میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیا الحسن کے نزدیک ''احتشام

حسین کی تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے موضوع اور فن کی دوئی کو ختم کیا اور ترقی پسند تنقید کے اکہرے پن کو دور کر کے اسے تمام ادیبوں کے لیے قابل قبول بنا دیا۔'' ۱۸ جہاں تک عصری شعور کا تعلق ہے تو احتشام حسین کی مارکسیت اور مادی جدلیات بنیادی طور پر عصری شعور ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس میں انھوں نے مادی جدلیات کو ادب پر منطبق کر کے اپنی پوری آگہی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ممتاز حسین ترقی پسند تحریک کے ان نقادوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے لبرل ازم اور آزاد خیالی کو اپنی تنقید کی اساس بنایا۔ وہ ترقی پسند اور مارکسی نقاد ہونے کے باوجود اپنے نظریات کے حوالے سے کبھی تنگ نظر اور متعصب نہیں رہے بقول شہزاد منظر:

> ''انھوں نے مارکسزم کو نظریے کے طور پر قبول ضرور کیا لیکن کبھی کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت قبول نہیں کی۔ ان کی ادبی زندگی کا بہت ہی مختصر سا عرصہ ایسا گزرا جب وہ ترقی پسندی کی انتہا پسندی کے دور میں گمراہی کے شکار ہوئے لیکن انھوں نے خود کو بہت جلد اس بھنور سے نکال لیا اور ادب کے بارے میں ترقی پسندوں کے بعض نظریات سے واضح اختلاف کیا۔''(۱۹)

ممتاز حسین مارکسزم کو میکانکی علم بنا کر ادب پر منطبق کرنے کے خلاف تھے۔ خصوصاً کلاسیکی ادب کی توضیح وتشریح میں مارکسی نقادوں نے جو غلطیاں کیں ممتاز حسین ان کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بیشتر ترقی پسند نقاد کلاسیکی ادب کو جانچنے کی سائنس سے نابلد تھے اور اسی وجہ سے وہ صحیح طور پر کلاسیکی ادب کا جائزہ نہیں لے سکے۔ ممتاز حسین کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ آج کے دور کی طبقاتی جنگ کی روشنی میں ہم غلامی کے عہد یا جاگیرداری نظام کے ادب کو پرکھنے کی کوشش کریں گے اور ان ادوار کے ادب کو فنی و جمالیاتی جہتوں کو نظر انداز کر کے محض سماجی حوالے کو اہمیت دیں گے تو یہ نہ صرف ان ادوار کے ادب کے ساتھ نا انصافی ہوگی بلکہ خود تحریک اور ادب کے حوالے سے بھی نقصان دہ ہوگا۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند فکر میں جس مسئلے نے اختر حسین رائے پوری کے یہاں ادبی دہشت پسندی کی صورت اختیار کر لی اور اسے سلجھانے میں احتشام حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم بھی کامیاب نہ ہو سکے اسے ممتاز حسین کی ادبی بصیرت نے خود مارکسی نقطۂ نظر سے حل کرنے میں بے مثال نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کا یہی ایک مقالہ پوری ترقی پسند تنقید کے سرمائے پر بھاری ہے۔''(۲۰)

اس اقتباس کی روشنی میں ممتاز حسین کا ادبی رتبہ اور تنقید میں مقام واضح ہو جاتا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب کو ترقی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ ادب بھی ہونا چاہیے۔ اپنے اس طرز فکر کا اظہار انھوں نے اپنے کئی مقالات میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک اہم مضمون ''رسالہ در معرفت استعارہ'' ہے۔ یہ مضمون ممتاز حسین کی تنقیدی فکر میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ جسے انھوں نے منفرد انداز میں

تحریر کیا ہے۔ تاریخ، فلسفہ اور مابعد الطبیعات کے حوالوں سے انھوں نے انقلابی استعارہ کی صراحت کرتے ہوئے جس بصیرت سے کام لیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ان کا یہ مضمون ان کی تنقیدی کتاب ''ادب اور شعور'' میں شامل ہے۔ اس مضمون کے بارے میں شہزاد منظر کا خیال ہے کہ یہ ایک ایسا مقالہ ہے کہ اس پائے کا اردو میں تو کجا برصغیر کی دیگر زبانوں میں بھی اس موضوع پر اس قدر وقیع مقالہ ملنا محال ہے۔ ان کے مقالے ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق'' کے بعد اس مقالے نے ان کی ادبی عظمت اور توقیر میں اضافہ کر دیا ہے۔[۲۱] ممتاز حسین نے اس مقالے میں قدیم علم بیان کی روشنی میں استعارے کی مختلف قسموں سے بحث کی ہے اور جدید عہد کی استعارہ سازی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقالہ اس دور میں لکھا گیا جب ترقی پسند تحریک انتہا پسندی کے دور سے گزر رہی تھی اور شاعری میں استعارات اور علامات کو عیب قرار دیا جا رہا تھا۔ چنانچہ ممتاز حسین نے اس مقالے میں ایک نئے انداز میں ترقی پسندوں کی سمت نمائی کی۔ انھوں نے بڑے لطیف اور اثر آفریں انداز میں یہ بیان کیا ہے کہ اس سائنسی زمانے میں فنونِ لطیفہ کو بھی فروغ کے بے پناہ مواقع ملے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس مشینی دور میں فنونِ لطیفہ کی انحطاط پذیری محض سائنس کی وجہ سے ہے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ''سائنس کی ترقی نے تو چشمِ آدم کو زیادہ سے زیادہ وا کیا ہے۔ اس کے حواس کو بجلیوں کی طاقت عطا کی ہے اور نہ یہ اس وجہ سے ہے کہ صنعتی ترقی بذاتِ خود جذباتِ حُسن اور لذتِ ہوش و گوش کی قاتل ہے۔ کیونکہ یہ صنعتی ترقی ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے کان لطیف سے لطیف تر ساز کی آواز سے آشنا ہوئے ہیں اور ہماری نگاہیں رنگوں کے گوناگوں امتزاجات اور لطیف ترین عکس ہائے گل سے مانوس ہوئی ہیں۔ جس قدر زیادہ سے زیادہ ساز و سامان تشبیہ و استعارے کے آج موجود ہیں اتنے پہلے کبھی بھی نہ تھے۔ آج ہم کو قوتِ اظہار پر بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ مقدرت ہے۔ آج ہی تو تخیل کے لیے زیادہ سے زیادہ دعوتِ فکر و نظر ہے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ آشتی چشم و گوش کی ایک فضائے خاموش ہے اس کا سبب وہی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے حصولِ نفع اور تقسیم اجرت کا غیر انسانی دستور ہے۔ وہ جو رشتۂ زر ہے وہی دشمنِ جان و دل، وہی دشمنِ شعر و نغمہ ہے۔ یہ فراقِ جسم و جاں کہ جسم ہلاک مشقت اور جاں فشردۂ رنگ و بو محرومِ آرزو ہے۔ یہ فراقِ عقل و جذبہ کہ عقل پاسبانِ کیسۂ زر اور جذبہ قتیلِ شیوۂ سوداگری ہے۔ اس کا وصال پر معنی اسی وقت ہوگا جبکہ ہماری محنت کا قطرہ قطرہ جو آج جامِ استحصال میں ہے ہمارے اپنے جام میں ہوگا۔''[۲۲]

ممتاز حسین کے اس محاکمے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کا ہر انحطاط جس میں فنونِ لطیفہ بھی شامل ہے استحصالی قوتوں کے باعث وقوع پذیر ہوتا ہے۔ وہ سرمایہ داری کے غلط نظام اور معیشت کی عدم مساوات کو پوری زندگی کے انتشار کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ممتاز حسین کے یہاں جو وسعتِ نظر،

تاریخی شعور اور ذہنی فکر کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی کئی ایک توجیحات ممکن ہیں لیکن ہماری نظر میں اس کا اہم ترین سبب یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ اور عصری تقاضوں کو بڑے قریب سے محسوس کیا ہے۔ ان کی تنقید کا یہ بنیادی اصول رہا ہے کہ وہ شعری اور ادبی اقدار کو متعین کرتے ہوئے نئے فکری رجحانات اور ان کی تشکیل میں سماجی رویے اور بدلتے ہوئے حقائق کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید میں سماجی مطالعے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

ممتاز حسین کا یہ کہنا کہ سائنس کی ترقی فنونِ لطیفہ کے زوال کا سبب نہیں ہے۔ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اپنے عہد میں ہونے والی سائنسی ترقی اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کے سماجی رویے ان کی نظر میں رہے ہیں اور انھوں نے بہت گہرائی میں جا کر اس سماجی حقیقت پسندی کا جائزہ لیا ہے۔ چنانچہ ممتاز حسین نے تنقید کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ اس میں اپنے عصر کے حوالے کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ حامدی کاشمیری نے ممتاز حسین کی تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات زور دے کر لکھی ہے کہ:

> ''ممتاز حسین ناقد کے لیے ادبی ذوق، ادبی مطالعہ یا تخلیقی جوہر ہی کافی نہیں سمجھتے وہ اس کے لیے اپنے عصر، اپنی سوسائٹی کی اقتصادی، سیاسی جد و جہد اور علوم متداولہ سے باخبر ہونے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔''(۲۳)

چنانچہ ممتاز حسین ترقی پسند تنقید میں اس اعتبار سے بھی بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے عصری تقاضوں کو اپنی تنقید میں پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور عصری شعور کو ایک نقاد کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ نقادوں میں علی سردار جعفری، ڈاکٹر عبدالعلیم، ظہیر کاشمیری، مجتبیٰ حسین، خلیل الرحمن اعظمی، احمد علی، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور دیگر کئی لوگ شامل ہیں۔ مجموعی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک کی ادبی اساس اسی بات پر رکھی گئی تھی کہ سماج کے مطالعے کو اولیت دی جائے چنانچہ تقریباً تمام ترقی پسند نقادوں کے یہاں ادب اور سماج کے گہرے روابط کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سماج کا زمانے کے ساتھ بھی گہرا تعلق بنتا ہے اور زمانہ بھی وہ جس میں ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں۔ یہاں پر ترقی پسند نقادوں کا کلاسیکی ادب کے حوالے سے نظریے کا سبب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنے اس عہد کو اہمیت دی ہے جس میں استحصال پسند طاقتوں اور جبر و استبداد کے ہتھکنڈوں کے مقابل پر نبرد آزما ہونے کا ایک واضح پیغام ملتا ہے۔ ان کے خیال میں ماضی کا سارا ادب جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی تعریف میں رطب اللسان دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا اس ادب پر زندگی کی بنیاد رکھنا ایک غیر فطری اور نامعقول عمل ہے۔ چنانچہ اسی باعث دیگر نقادوں کے مقابلے میں ترقی پسند نقاد عصری شعور سے پوری طرح بہرہ ور نظر آتے ہیں۔ انھوں نے زمانے کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھیں اور اس کی دھڑکنوں کو اس طرح صاف محسوس کیا کہ وہ بجا طور پر اپنے عہد کے نمائندے

بن گئے جن کی تحریروں میں زمانے کا سوز وساز اور اس کی تمام تر حسیّات شامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاءالحسن، ڈاکٹر، اردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۷

۲۔ احتشام حسین، سید، تنقیدی جائزے، الٰہ آباد: الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۱ء، ص ۳۳

۳۔ سجاد ظہیر، اُردو کی جدید انقلابی شاعری، لکھنؤ: نیا ادب، ۱۹۳۹ء، ص ۲۷

۴۔ ضیاءالحسن، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا عمرانی دبستان، ص ۲۱۷۔۲۱۸

۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، روزن چہ احتیاج اگر خانہ تارنیست، اختر حسین رائے پوری نمبر، شمارہ: ۱۹۴، کراچی، افکار ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۷

۶۔ خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲۶

۷۔ اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، بمبئی: نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز، ۱۹۴۸ء، ص ۵۷

۸۔ مظفر علی سید، اختر حسین۔۔ ناقد بطور پیش رو، کراچی: افکار، س۔ن، ص ۱۴۵

۹۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۳۲۲

۱۰۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، اشاعت ہفتم، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۰ء، ص ۵۲۲

۱۱۔ خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص ۳۳۱

۱۲۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء، ص ۳۵۱

۱۳۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، حیدر آباد: ادارہ اشاعت اردو، ۱۹۴۵ء، ص ۴۸

۱۴۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۲

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۲۴

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، احتشام حسین کا تصور ادب و نقد، ارتقا، کتابی سلسلہ نمبر ۱۲، احتشام حسین نمبر، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۹۳

۱۷۔ احتشام حسین، سید، تنقیدی جائزے، ص ۱۶

۱۸۔ ضیاءالحسن، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا عمرانی دبستان، ص ۲۵۹

۱۹۔ شہزاد منظر، اردو تنقید کے پچاس سال، ص ۸۹

۲۰۔ خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص ۳۵۷

۲۱۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، ص ۹۳

۲۲۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، کراچی: اُردو اکیڈمی، ۱۹۶۱ء، ص ۷۵، ۷۶

۲۳۔ حامدی کاشمیری، معاصر اردو تنقید ایک نئے تناظر میں، سری نگر: ادارہ ادب، ۱۹۹۲ء، ص ۹۷